فتاوای فیروز شاہی اور عصری مسائل

(۱)

از جناب ظفر الاسلام صاحب استاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام سے نہ صرف یہاں کی سیاسی زندگی کو ایک نیا رخ ملا بلکہ سماجی و ثقافتی دنیا میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سلاطین دہلی کی علم دوستی اور معارف پروری مختلف علوم وفنون کی ترویج و ترقی کا ذریعہ بنی اور ان کی شاہانہ سرپرستی اور فیاضانہ زرپاشی کے فیض سے دہلی ایسے جلیل القدر علمار اور دانشوران کا مرکز بن گیا جن کی نظیر بقول معاصر مورخ ضیار الدین اس وقت کی اسلامی دنیا میں ملنا مشکل تھی [۱]۔ تفسیر وحدیث، فقہ و اصول فقہ، تاریخ و تذکرہ، شعر و ادب، نحو لغت، فلسفہ و منطق جیسے متعدد علوم وفنون ان کی علمی دلچسپی کا باعث بنے اور ان کی صلاحیتیں مختلف موضوعات پر گراں قدر تخلیقات کی صورت میں اجاگر ہوئیں۔

---

[۱] ضیار الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، سنہ ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۵۲-۳۵۳ نیز دیکھئے، شیخ نور الحق، زبدۃ التواریخ، اوٹوگراف نمبر ۱۸ (مخطوطہ برٹش میوزیم)، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۳۰ ب۔

یہ علمی فضا جس کو پروان چڑھانے میں عہد علائی (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶) کو خاص دخل ہے بعد کے زمانہ میں بھی برقرار رہی چنانچہ تغلق سلاطین کا دور حکومت سیاسی کارناموں کے علاوہ علمی وادبی ترقی کے لئے بھی معروف ہے۔ فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸) نے جو بذات خود علوم دینیہ کا ماہر اور علوم عقلیہ کا دلدادہ تھا علوم وفنون کی نشر و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔[۱] مدارس و مکاتب کا قیام، علماء و فضلاء کی ہمت افزائی اور تصنیفی و تالیفی مشاغل میں ذاتی دلچسپی سلطان کی علمی خدمات کے مختلف مظاہر ہیں۔ گرچہ علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے یہ زمانہ عہد علائی سے برتر نہ تھا۔ لیکن اس دور کا خاص امتیاز علوم دینیہ بالخصوص علم فقہ کا فروغ پانا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت مذہبی وفقہی لٹریچر کے اس معتدبہ وقیمتی سرمایہ سے ملتا ہے جو عہد فیروز شاہی کی یادگار ہے۔[۲] فتاوائ فیروز شاہی جو اس مضمون کا خاص

---

[۱] برنی، ص ۵۵۹، شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۰ ص ۱۷۳، ۱۷۹، ۵۸۰، سیرت فیروز شاہی، قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار نمبر ۱۱۱) ص ۱۲۷، ۲۹۰، فتوحات فیروز شاہی (مرتبہ شیخ عبدالرشید) علی گڑھ، ص ۱۱، ۱۳، ۱۵۔ علوم عقلیہ میں فیروز شاہ کو خاص دلچسپی علم نجوم سے تھی۔ اس فن پر اس کی ایما سے کئی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس نے علم نجوم پر بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی ترجمہ بھی کرایا ان میں سب سے زیادہ مشہور عزالدین خالدخانی کا منظوم ترجمہ "دلائل فیروز شاہی" ہے (سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۱ - ۲۹۷)

[۲] فتاوای فیروز شاہی کے علاوہ اس دور کی دوسری قابل ذکر تالیفات تفسیر تاتارخانی فتاوای تاتارخانی، فوائد فیروز شاہی اور فتوحات فیروز شاہی ہیں۔ ان پر تفصیلی معلومات کے لئے دیکھئے خاکسار کا مضمون "ورکس آف لیگل نیچر ان دی ایج آف فیروز شاہ" (پروسیڈنگ آف انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی، دہلی، ۱۹۸۰، ص ۳۲۹ - ۳۳۷)

موضوع ہے اس سرمایہ کا ایک حصہ ہے

فتاوای فیروز شاہی[1] اصلاً صدر الدین یعقوب مظفر کہرامی[2] کی تالیف ہے لیکن اس کی تکمیل و تنقیح سے قبل ہی مولف جاں بحق ہوگئے۔ یہ ناتمام مسودہ ایک عرصہ تک ان کے ورثہ کے قبضہ میں غیر معروف حالت میں پڑا رہا۔ جب فیروز شاہ تغلق کو اس کا علم ہوا تو خود اپنی نگرانی میں اس کو از سر نو مرتب کر دیا۔ اس کا کوئی قطعی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا کہ اس کی دوبارہ تالیف و ترتیب کس کے ذریعہ عمل میں آئی۔ فتاویٰ کے دیباچہ میں مولف نے اس کی تالیف کا پس منظر بیان کیا ہے اور اس کے اصل مؤلف کا نام تحریر کیا ہے لیکن خود اپنا نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے۔

فتاوای فیروز شاہی کا مولف کون تھا، اس کی تالیف کتنے مراحل سے گذری

---

[1] فتاوای فیروز شاہی کے مخطوطات مولانا آزاد لائبریری (یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ، مذہب ۳۶۰)، انڈیا آفس لائبریری، لندن (اتیھ ۲۵۶۴) اور خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ انڈیا آفس کا نسخہ "فقہ فیروز شاہی" کے نام سے معنون ہے۔ میرا مطالعہ مولانا آزاد لائبریری کے نسخہ پر مبنی ہے۔

[2] مولف کے بارے میں مفصل معلومات فراہم نہ ہو سکیں، فہرست نگاروں اور جدید مورخین نے ان کی نسبت "مختلف انداز" (کہرامی، کرمانی، کرامی، کرانی) میں تحریر کیا ہے۔ علی گڑھ کے نسخہ میں "کہرامی" لکھا ہوا ہے اس لئے میں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ کہرامی کہرام کی جانب سے منسوب ہے، یہ پنجاب کا قدیم تاریخی قصبہ ہے جو پٹیالہ سے ۱۶ میل کے ۱۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مقام ہندوستان میں محمد غوری کی اولین اہم مفتوحات میں سے ہے۔ عہد سلطنت میں یہ پرگنہ کہرام کے صدر مقام کی حیثیت سے باقی رہا۔ (امپریل گزیٹیر آف انڈیا، نئی دہلی، جلد ۱۲، صفحہ ۲۳۷)

ان مباحث سے قطع نظر طرز تالیف، انداز بیان اور تنوع زبان کئی حیثیتوں سے اس کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں فتاویٰ کے جتنے مجموعے تیار کیے گئے خواہ کسی عالم وفقیہ کے ذریعہ ذاتی طور پر یا کسی سلطان، وزیر وامیر کی ایما پر ان میں سے بیشتر مضامین ومباحث کے انتخاب اور انداز بیان کے اعتبار سے فقہ کی متداول کتابوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں ان میں فقہ کے معروف مسائل پر فقہاء متقدمین کی رایوں کو مختلف ابواب کے تحت جمع کیا گیا ہے عصری مسائل شاذ ونادر ہی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ فتاویٰ جو سلطان یا کسی وزیر کے حکم سے مرتب کئے گئے ہیں اس دور کے مخصوص مسائل اور معاصر علماء کے فتووں و قانونی فیصلوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ مزید براں یہ مجموعے حتیٰ کہ وہ بھی جن کا مقصد انتظامیہ، عدلیہ اور عام لوگوں کو احکام شرعیہ سے روشناس کرانا تھا زیادہ تر عربی زبان میں ہیں جس سے علماء، قضاۃ اور مفتیان یقیناً بہرور تھے لیکن انتظامیہ کے آفیسران اور متوسط پڑھے لکھے لوگ عربی کی بنسبت فارسی سے زیادہ آشنا تھے جو اس وقت کی سرکاری زبان تھی اور علمی حلقوں میں مافی الضمیر کے اظہار کے لئے عام طور پر رائج تھی۔

فتاوائ فیروز شاہی کا طریقہ تالیف اس عام نہج سے مختلف ہے۔ گرچہ مضامین و مباحث کے اعتبار سے یہ فتاویٰ بھی کتاب، باب وفصل میں منقسم ہے لیکن مسائل کی توضیح وتشریح کے لئے استفتاء و فتویٰ کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ پوری کتاب استفتاء و فتویٰ کی صورت میں مرتب ہے۔ زبان کے معاملہ میں بھی یہ فتاویٰ منفرد ہے۔ استفتاء و فتوی فارسی میں درج ہیں لیکن فتوی کی تائید میں اقتباسات فقہ کی عربی کتابوں سے دیے گئے

ہیں[1]۔ تقریباً پانچ سو صفحات کے اس ضخیم مجموعہ میں مستفتی کا نام صرف ایک استفتاء سے قبل مذکور ہے[2]۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فتاوای فیروز شاہی میں مندرجہ مسائل واقعۃً مولف کے سامنے ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ سوالات کی نوعیت اور جزئیات کی کثرت پر نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فقہی سوالات خود مولف کے تیار کردہ ہیں۔ تاہم اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ استفتا دوسروں کے پیش کردہ رہے ہوں گے۔ اس اختلافی بحث کے باوجود کہ استفتاء مولف کے ذہن کی پیداوار تھے یا دوسروں کے پیش کردہ تھے۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فتاویٰ کی تالیف و ترتیب میں مولف نے گرد و پیش کے حالات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ فتاویٰ میں ایک دو نہیں سینکڑوں ایسے مسائل درج ہیں جو بالخصوص اس کے زمانۂ تالیف سے متعلق نظر آتے ہیں۔ یہ فقہی سوالات خواہ عبادات کے ضمن میں مذکور ہیں یا معاملات کے ابواب میں زیر بحث آئے ہیں۔ عہد وسطیٰ کے ہندستان کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں اور دوسری جانب فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کو جانچنے و پرکھنے کی ایک سنجیدہ کوشش کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان نکات کی وضاحت کے لئے ذیل میں کچھ منتخبہ مسائل کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے ان مسائل سے بحث کی جائے گی جو عہد سلطنت

---

[1] مولف نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں قابل ذکر الجامع الصغیر، کنز الدقائق، شرح الطحاوی، الواقعات الحسامیہ، محیط برہانی، فتاویٰ قاضی خاں، الہدایہ و الفتاوی السراجیہ وغیرہ ہیں۔

[2] باب العاریۃ میں ایک استفتاء امیر احمد خلج کے نام سے پیش کیا گیا ہے (فتاوای فیروز شاہی، ۳۸۸ الف)

کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور بعد میں ان استفتاء پر روشنی ڈالی جائے گی جو عمومی انداز میں ان حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

پہلی نوعیت کے مسائل میں ہم سب سے پہلے باب صلوٰۃ المسافر کے ایک استفتاء کا ذکر کرتے ہیں جس میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اصلی وطن سے منتقل ہوکر دہلی میں مع اپنے اہل و عیال سکونت اختیار کرتا ہے اور پھر بعد میں کبھی اپنے وطن کا قصد کرتا ہے تو کیا وطن اصلی میں وہ مسافر کے احکام کا پابند ہوگا یا مقیم کے؟ فتویٰ کی رو سے وہ مسافر کے احکام کا پابند ہوگا[1] بادی النظر میں یہ ایک سادہ سا مسئلہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر عہد سلطنت میں دہلی کی سیاسی و ثقافتی حیثیت کی روشنی میں اس پر غور کیا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت واضح ہوجاتی ہے۔ دار السلطنت ہونے کی وجہ سے دہلی کو جو سیاسی اہمیت و مرکزیت حاصل تھی اس سے قطع نظر وسط ایشیا میں منگولوں کی بلا خیز تباہ کاری کے بعد دہلی میں پوری اسلامی دنیا کے امراء و شعراء و ادباء، فنکاروں و دستکاروں کے لئے مرجع و ماویٰ بن گیا تھا۔ معاصر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایشیا بلکہ ایران اور دوسرے ممالک سے بھی مختلف مشاغل سے تعلق رکھنے والے لوگ ہندستان آئے اور یہاں سکونت اختیار کی[2]۔ اس کے علاوہ خود ہندستان کے دوسرے

---

[1] فتاوای فیروز شاہی، ۶۹ ب

[2] منہاج السراج، طبقات ناصری، کابل، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۶، عصامی، فتوح السلاطین مدراس، ۱۹۴۸ء ص ۱۱۴-۱۱۵، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۳-۵۴

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علاقوں سے منتقل ہو کر دہلی میں آباد ہونے کے متفرق واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال مذکورہ فتویٰ اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ یہ وطن اصلی سے منتقل ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کرنے والوں کے وطن اول کو منسوخ قرار دیتا ہے اور دہلی کو ان کے وطن کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔

اسی طرح روزہ کے باب میں ایک استفتاء اس انداز میں مذکور ہے کہ اگر دولت آباد کے کچھ لوگ دہلی میں یہ بیان دیں کہ دولت آباد و دہلی کی رویت ہلال میں اختلاف ہے اور اس کی وجہ سے دونوں شہروں میں ایک روزہ کا فرق ظاہر ہو مثلاً جس روز دولت آباد میں تیسواں روزہ اور دہلی میں انتیسواں ہے پس اگر دہلی میں انتیس رمضان کو چاند نہ دکھائی دے تو کیا دولت آباد کی رویت کے مطابق دہلی کے لوگ دوسرے روز (جو ان کے لحاظ سے تیسواں روزہ ہوگا) روزہ نہ رکھنے اور عید منانے کے مجاز ہوں گے۔ اور اگر انتیس روزہ کے بعد عید منالیں تو کیا ان لوگوں پر ایک روزہ کی قضا واجب ہوگی[1]۔ یہ مسئلہ خالصتہً فقہی نوعیت کا ہے لیکن اس کا تاریخی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ دونوں شہروں کے درمیان آمد و رفت کی کثرت اور دونوں مقامات کے لوگوں میں باہمی ربط کی صورت ہی میں اس طرح کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ صورت حال درحقیقت دہلی و دکن یا شمال و جنوب کے مابین سیاسی و

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے دور میں (۱۳۲۵ - ۱۳۵۱) دہلی کو نہ صرف ہندستان بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کا سب سے عظیم الشان شہر بتایا ہے (رحلۃ ابن بطوطہ، القاہرہ ۱۸۵۸ء، جزء ثانی، ص ۱۵)

[1] فتاوای فیروز شاہی، ۸۸ ب

ثقافتی تعلقات کی استواری کی عکاس ہے جس کے لئے سلاطین دہلی اور محمد بن تغلق کی خدمات نمایاں اور قابل قدر رہیں [1]

معاون و رکاز کا پانچواں حصہ (خمس) مسلم حکومت کے ذرائع آمدنی میں داخل ہے۔ اس کی تفصیل فقہ کی عام کتابوں میں، زکوٰۃ کے ضمن میں ملتی ہے۔ فتاوای فیروز شاہی کو اس سلسلہ میں کوئی استثنائی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس فتاویٰ میں بعض ایسے مسائل ذکر کیئے ہیں جس سے ہندستان کے قدیم سکوں کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے مثلاً ایک سوال اس انداز میں دریافت کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص چاندی کا ایسا مدفون خزانہ بیابان میں پاتا ہے جس پر ہندوؤں کے مذہبی نشانات ظاہر ہیں تو کیا شریعت کی رو سے اس پر خمس واجب ہوگا اور باقی ماندہ پانے والے کا حصہ ہوگا؟ جواب اثبات میں دیا گیا ہے [2]۔ اس مسئلہ کا قانونی پہلو یہاں زیر بحث نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے اس پر غور کرنا مقصود ہے کہ آیا واقعتہً ہندوؤں کے سکوں پر ان کے

---

[1] تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ محمد بن تغلق نے دارالسلطنت کو بالکلیہ دہلی سے دولت آباد منتقل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ اس نے محض دہلی کے مخصوص طبقے (علماء و مشائخ اور ارکان سلطنت) کے لوگوں کو وہاں آباد کرنا چاہا تھا تاکہ دکن میں اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار ہوں۔ شمال و جنوب کے درمیان تمدنی و ثقافتی اختلاف کی خلیج پر ہو اور مسلمانوں کی مقامی آبادی سیاسی استحکام کا باعث بن سکے۔ گرچہ یہ منصوبہ وقتی طور پر ناکامی سے ہمکنار ہوا لیکن اس کے دوررس نتائج دکن میں اسلامی تہذیب کے فروغ اور بہمنی سلطنت جیسی مسلم ریاستوں کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے، خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ادارۂ ادبیات دلی، ۱۹۸۱ء ص ۳۳۹ - ۳۴۵۔

[2] فتاوای فیروز شاہی، ۱۷ الف

مذہبی علائم ہوتے تھے جس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیش کیا گیا ہے[۱]۔ ہندستان میں عہد قدیم کے جو سکّے دریافت ہوئے ہیں ان سے یہ ثبوت بہم پہونچتا ہے کہ اس دور کے بعض سکّوں پر دیوی دیوتا بالخصوص لکشمی دیوی کی تصویر ہوتی تھی[۲]۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فتاوای فیروز شاہی سے نہ صرف قدیم سکوں کی جانب اشارہ ملتا ہے بلکہ خود سلاطینِ دہلی کے دور میں رائج سکوں (جیتل وتنکہ) کی بابت بھی متعدد حوالہ جات ملتے ہیں بالخصوص ان مسائل کے ضمن میں جو خرید و فروخت، بیع وتجارت اور امانت و ودیعت سے متعلق ہیں[۳]۔

فقہ کی متداول تالیفات میں مفقود کا باب بھی شامل ہے۔ اس باب کے تحت ان اشخاص کے بارے میں بحث کی گئی ہے جو غائب ہو گئے ہوں اور ان کی حیات و موت کی بابت قطعی طور سے کچھ معلوم نہ ہو۔ اسلامی شریعت ایسے لوگوں کو مفقود قرار دے کر ان کے لئے مخصوص قوانین اور ان کے اہل وعیال اور جائداد کی نگہداشت کے لئے کچھ ضوابط متعین کرتی ہے[۴]۔ فتاوای فیروز شاہی نے بھی ان مسائل

---

[۱] فقہ کی دوسری کتابوں میں عمومی انداز میں شرک کے نشانات رکھنے والا خزانہ زیر بحث آیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے برہان الدین علی بن ابوبکر المرغنانی، الہدایہ، لکھنؤ، ۱۳۲۵ھ جلد اول صہ ۱۸۲۔

[۲] ڈی۔سی۔سرکار، اسٹڈیز ان انڈین کوائنس، پٹنہ، ۱۹۶۸ء صہ ۱۷، ۳۲۔۳۳۔۲۳۳

[۳] فتاوای فیروز شاہی، ۳۰۸ الف۔ ۳۰۸ ب، ۳۱۰ الف، ۴۰۴ الف، ۴۰۳ ب

[۴] الہدایہ، جلد دوم صہ ۵۹۶-۵۹۷۔

پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جن کے ذکر کی یہاں حاجت نہیں لیکن ایک استفتار کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو تاریخی نقطۂ نظر اہمیت و دلچسپی کا حامل ہے۔ وہ استفتار ان الفاظ میں مذکور ہے: اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مغلوں (منگولوں) کے ہاتھوں اسیر ہو جائے اور اس کی حیات و موت کے بارے میں کوئی ثبوت واقعی موجود نہ ہو تو کیا اسے شرعاً مفقود تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر ایسے شخص نے وطن میں کوئی جائداد چھوڑی ہے تو کیا اس کی دیکھ بھال کے لئے سلطان کی جانب سے کسی کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیا گیا ہے[1]۔ اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں تھا کہ مذکورہ صورت حال میں اس فتویٰ پر عمل کیا جاتا تھا لیکن یہ امر بہرحال مسلم ہے کہ یہ استفتار ایک اہم سیاسی و دفاعی مسئلہ کی نشاندہی کرتا ہے جس سے سلاطین دہلی دوچار تھے۔ معاصر تاریخی کتب اور تذکروں میں لاہور و ملتان کی راہ سے ہندستان پر منگولوں کے متعدد حملے اور یہاں کے باشندوں کو لوٹ و مار کا نشانہ بنانے اور اسیر کرنے کے واقعات ملتے ہیں جن سے اس مسئلے کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے[2]۔

عہد سلطنت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ان چند مسائل کے علاوہ فتاوای فیروز شاہی متعدد ایسے سوالات و جوابات پر مشتمل ہے جو عمومی انداز میں سماجی مسائل کی عکاسی کرتے

---

[1] فتاوای فیروز شاہی، ۲۴۵ ب، ۲۴۸ ب

[2] امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، مخطوطہ (مولانا آزاد لائبریری) حبیب گنج کلکشن، ۵/۱۸، ۲۹ الف، امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، نولکشور، ۱۳۰۲ھ/۱۸۹۴ء، ص ۱۷-۱۸، خیر المجالس (ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، مرتبہ حمید قلندر) با تصحیح و مقدمہ از خلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ص ۲۰۶، ۲۵۹-۲۶۰، عفیف، ص ۴۹، ۱۳۶۔

ہیں اور فقہ اسلامی کی رو سے انتظامی، اقتصادی و فوجی امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ مسائل فتاویٰ میں فقہ کے عام ابواب کے تحت مندرج ہیں۔ ہم نے اپنے مطالعہ کی آسانی کے لئے ان کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے: (الف) معاشرت (ب) معاشیات (ج) حرب و جنگ۔

(معاشرت) عہد وسطیٰ کے معاشرتی مسائل میں ہندو و مسلم تعلقات اور ان کے باہمی معاملات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ درحقیقت ان تعلقات کی داغ بیل قدیم ہندوستان میں مسلم تجار کی آمد و رفت اور ساحلی علاقوں میں ان کی آبادیوں کے قیام سے پڑ چکی تھیں لیکن مسلم حکومت کے قیام کے بعد تعلقات کی نوعیت بدل گئی۔ اس کے علاوہ باہمی میل و جول کے نئے نئے مواقع فراہم ہونے سے ان میں وسعت پیدا ہوئی اور معاشرتی و معاشی تقاضوں کے تحت معاملات کی نئی نئی راہیں ہموار ہوئیں۔ لازماً بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جو معاصر علماء و فقہاء کی توجہ کا مرکز بنے مثلاً یہ کہ ہندو مسلم تعلقات کن بنیادوں پر قائم ہوں، ان کے مابین باہمی لین دین کی نوعیت کیا ہو اور ان کے ساتھ حکومت کا طریقہ سلوک کیا ہو۔ فتاوای فیروز شاہی میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے لیکن ان پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کے بنیادی سوال ہندوؤں کی شرعی حیثیت سے متعلق اس دور کے علماء کے خیالات اور سلاطین کے نقطۂ نظر کی مختصراً وضاحت کی جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت سندھ میں محمد بن قاسم کے زیر انتظام ۷۱۲ء میں قائم ہوئی اور ہندوؤں کی شرعی حیثیت کا مسئلہ بھی پہلی دفعہ اسی وقت ظہور پذیر ہوا۔ معاصر علماء کے فتوی کے مطابق محمد بن قاسم نے انھیں "شبہ اہل کتاب" کی حیثیت سے شمار کیا اور اہل ذمہ کے زمرہ میں شمار کیا۔[۱]

---

۱ محمد علی بن حامد بن ابی بکر، چچ نامہ، حیدرآباد، ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۰۸-۲۰۹۔

لیکن عہد سلطنت میں یہ مسئلہ پھر موضوع بحث بنا اور علمار کے مابین اس پر اختلاف رہا۔ ایک طبقہ انھیں اہل ذمہ قرار دینے کے حق میں تھا اور دوسرا (غالباً شافعی مسلک کی اتباع میں) انھیں یہ مراعات دینے کے خلاف تھا۔ سلطان التمش (۱۲۱۱-۳۶ ۱۲) کے ہمعصر اور مشہور عالم سید نور الدین مبارک غزنوی موخر الذکر خیال کے حامی تھے[1] معاصر مورخ ضیار الدین برنی کے مطابق اس دور میں علمار کے ایک وفد نے سلطان سے ملاقات کے دوران ہندوؤں کو اہل ذمہ کے حقوق نہ دینے کا مشورہ دیا تھا[2] یہ عین ممکن ہے کہ نور الدین مبارک غزنوی اس وفد میں شامل رہے ہوں۔ برنی خود بھی ہندوؤں کو ذمی کا درجہ دینے کے خلاف تھے[3] اس کے برعکس جمہور علمار انھیں ذمی قرار دینے کے قائل تھے اور سلاطین دہلی بھی نظری و عملی طور پر اسی مسلک کے متبع تھے۔ معاصر تاریخی لٹریچر میں ہندوؤں کے لئے لفظ ذمی کے استعمال کی متعدد مثالیں ملتی ہیں[4] فیروز شاہ نے فتوحات فیروز شاہی میں ان پر احکام ذمی کے نفاذ کا ذکر کیا ہے[5] برنی نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ

---

[1] برنی، تاریخ فیروز شاہی، صـ۱۰۹-۱۱۰۔

[2] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات صـ۱۱۱ (بحوالہ صحیفہ نعت محمدی، مخطوط رضا لائبریری، رامپور)

[3] برنی، فتاوای جہانداری، روٹو گراف نمبر ۶۸ (مخطوط انڈیا آفس) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۱۲ الف۔

[4] برنی، تاریخ فیروز شاہی، صـ ۸۷، ۱۴۱، ۲۹۰، عفیف، تاریخ فیروز شاہی، صـ۱۸۰۔

[5] فتوحات فیروز شاہی، صـ ۵، ۱۶-۱۷، ۲۰

سلاطین عملاً اس کے خیال سے متفق نہ تھے[1]۔ فتاوای فیروز شاہی جو سلطان کے ایما پر ترتیب دیا گیا تھا جمہور علمار کے خیال کا ترجمان نظر آتا ہے اس لئے فتاوی کی ذمیوں سے متعلق عمومی بحث کو ہندوؤں پر منطبق کرنا خلاف واقعہ نہ ہوگا۔

فتاوای فیروز شاہی میں ذمیوں سے تعلقات کی بابت جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں دلچسپ اور قابل ذکر یہ ہیں: ذمی کے سوال کا جواب دینا[2]، بیماری کی حالت میں ان کی عیادت کرنا[3]، ان کی دعوت وضیافت قبول کرنا[4]، ان کی فرمائش پر انھیں قرآن و اسلامی فقہ کی تعلیم دینا[5] اور ان کے غربا کو صدقۂ فطر دینا[6]۔ فتاوای فیروز شاہی نے ان تمام امور کو جائز قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ فتاوی نے ان مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جو باہمی لین دین کے معاملات اور ایک دوسرے کی عزت جان ومال کے تحفظ سے وابستہ ہیں اور سماج کے مختلف طبقوں کے مابین پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس نوع کی مباحث فقہ کی دوسری کتابوں اور فتاوی کے دیگر مجموعوں میں بھی ملتے ہیں۔ فتاوای فیروز شاہی میں جن نکات پر خاص زور دیا گیا ہے وہ ہیں قصاص و خوں بہا کے معاملات میں مسلم و ذمی کے

---

[1] فتاوای جہانداری، ورق ۱۲۳ الف

[2] فتاوای فیروز شاہی، ۴۸۷ ب

[3] ایضاً، ۳۳۶ ب

[4] ایضاً، ۴۸۴ الف

[5] ایضاً، ۲۱۲ الف، یہ جزئیہ اس دور میں فقہ کے عام رواج اور مقبولیت کو بھی ظاہر کرتا ہے، ورنہ قرآن کے بعد حدیث کا ذکر مثال کے طور پر ضرور آتا۔

[6] ایضاً، ۷۶ ب

درمیان برابری[1]، ذمی کے قرض کی ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر کی صورت میں مقروض مسلم کو قید کرنے کا جواز[2] ارضی موات کو امام یا سلطان کی اجازت سے کاشت میں لانے پر اس کی ملکیت کے استحقاق[3] اور حق شفعہ کے ثبوت میں مسلم و ذمی کے مابین عدم تفریق[4] وغیرہ۔

ذمیوں کے حقوق کی وضاحت فتاوای فیروز شاہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ذمیوں سے متعلق مختلف فیہ مسائل میں مولف فتاوای نے ان فقہار کی رائے کو ترجیح دی جنھوں نے ان مسائل میں نرم رویہ اختیار کیا ہے۔ ممکن ہے ہندوستان کے مخصوص حالات اور مشترک سماج کی پیچیدگیاں مولف کے پیش نظر رہی ہوں یا پھر فقہ حنفی کا عام رواج اور سرکاری طور پر اس کی مقبولیت[5] مولف کی ترجیحی رائے کی وجہ رہی ہو اور یہ سبھی کو معلوم ہے کہ ذمیوں کے بارے میں حنفی فقہار نسبتہً زیادہ رواداراور وسیع المشرب ہیں۔

۱؎ ایضاً، ۲۳۵ الف۔ ۳۳۶ ب، ابن بطوطہ کے سفرنامے میں اس کی بعض عملی مثالیں محمد تغلق کے دور سے متعلق ملتی ہیں، (رحلہ، جزء ثانی، ص۵۰)

۲؎ فتاوای فیروز شاہی، ۵۰۸ ب۔ برنی اور عفیف دونوں ذکر کرتے ہیں کہ مسلم امراء ملتان کے ہندو تاجرین سے وقتاً فوقتاً قرض لیا کرتے تھے، لیکن استفتار میں مذکور جزئیہ کی کوئی مثال ان کی کتابوں میں نہیں ملتی (برنی، ص۱۲۰، عفیف، ص۶۱)

۳؎ فتاوای فیروز شاہی، ۲۵۰ ب،

۴؎ ایضاً، ۴۵۵ الف

۵؎ مسالک الابصار، ص۲۷، القلقشندی، صبح الاعشیٰ، القاہرہ، ۱۹۱۴ء، جزء خامس ص۶۹، دولرانی خضرخاں، ص۴۶-۴۷

ذمیوں کے ذکر میں ان مسائل پر روشنی ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو کسی خاندان کے ایک فرد یا کچھ افراد کے قبول اسلام کی صورت میں رونما ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ بیٹا مسلم ہے اور والدین کافر تو کیا بیٹا ایسے والدین کے حقوق کی پاسداری کا مکلف ہوگا۔ اس طرح کے مسائل پر بحث کر کے فتاوای فیروز شاہی نے یہ قانونی نکتہ ذہن نشین کرانا چاہا ہے کہ تبدیلی مذہب سے والدین کے حقوق ساقط نہیں ہوتے، بلکہ یہ کہ ایک غیر مسلم باپ کی فرمانبرداری، خدمت اور بوقت ضرورت مالی اعانت اسی طرح واجب و مستحسن ہے جس طرح ایک مسلم باپ کی[1] بشرطیکہ یہ چیزیں معصیت الٰہی تک نہ پہنچادیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک بوڑھا ذمی بت خانہ میں بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنے مسلم بیٹے سے گھر تک اسے پہنچانے کے لئے کہتا ہے تو فتاوی کی رو سے اس اعانت میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر وہ گھر سے بت خانہ جانا چاہتا ہے اور مسلم بیٹے سے پہنچانے کے لئے کہتا ہے تو اس حکم کی بجاآوری بیٹے کے لئے جائز نہ ہوگی اس لئے کہ یہ معصیت کے کام میں مدد پہنچانے کے مترادف ہوگا۔[2]

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے تغلق سلاطین بالخصوص محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق نے نمایاں خدمات انجام دیں، محمد بن تغلق نے اس مقصد کے لئے دور دراز علاقوں میں علماء و مشائخ کو بھیجا۔[3]

---

[1] فتاوای فیروز شاہی، ۵۰۹ ب

[2] فتاوای فیروز شاہی، ۵۰۹ الف

[3] میر خورد، سیر الاولیاء، دہلی، ۱۳۰۲ھ، صـ ۲۸۹، برنی، تاریخ فیروز شاہی، صـ ۵۰۸، ۵۱۸، عصامی، صـ ۶۰۶، شہاب الدین العمری، مسالک الابصار۔ و ممالک الابصار۔

فیروز شاہ کے دکن منصوبہ کا ایک اہم مقصد اسلام اور اسلامی تمدن کی اشاعت تھا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس کے علاوہ فتوحات فیروز شاہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قبول اسلام کی جانب لوگوں کو راغب کرنے کے لئے اس نے مراعات اور نوازشات عطا کرنے کا سرکاری اعلان جاری کیا جس کے نتیجہ میں لوگ کثیر تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوئے[۱] ان حالات کی روشنی میں اوپر کے مسائل کا جائزہ لیا جائے تو ان کی اہمیت و افادیت صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے۔

(باقی)

---

[۱] فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۶-۱۷ (انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسپیس، علی گڑھ ص ۴۴-۴۵

انتہائی ضروری

○

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھئے کہ آپ کی سالانہ مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ براہ کرم فوری طور پر سالانہ چندہ

منیجر مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

کے پتہ پر بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

منیجر ادارہ برہان